DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.276

ڈاکٹر ساجد جاوید

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

تاریخِ ادبِ اردو از جمیل جالبی: تکنیک، معیار اور مسائل اور حدود

Dr. Sajid Javed
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Sargodha, Sargodha.

Jameel Jalibi's History of Urdu Literature; The Techniques, Standard and Limitations, A Critical and Research Analyses

ABSTRACT

History of Urdu literature has been a very phenomenal subject of Urdu research. Our book-shelves are adorned and well equipped with esteemed writings of esteemed historians of Urdu language and literature. It is the subject of keen importance to analyze, compare, value and put them on the touch-stone of modern research that invites the critic to highlight the right areas where the historians have done exceedingly well and find genuine requisitions, still deemed necessary to revise the existing history works. Jameel Jalibi is the most famous and well-read historian of Urdu language and literature among the all. His (book series) "Tareekh-e-Adab-e-Urdu" consisting of 4 volumes keeps the place amongst highest ranks of history of Urdu. In this article, the technique of all of his four volumes has been discussed chronologically, critically and analytically.

Keywords: *Jameel Jalibi, History of Urdu Literature, Tareekh -e-Adab-e-Urdu, Standards and Limitation..*

اردو ادب کی مستند اور معیاری تاریخ کی بات کی جائے تو چند ایک تواریخ کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب "تاریخ ادب اردو" سر فہرست آتی ہے۔ قریب نصف صدی سے یہ کتاب اپنی مثال آپ بن کر اس روایت کا حصہ ہے۔ "آب حیات" سے لے کر مذکورہ تاریخ تک

Received: 04th Aug, 2022 | Accepted: 11th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* **Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)**

تکنیکی طور پر مختلف تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ لیکن مسائل جوں کے توں ہی رہے۔ اس میں سب سے اہم عنصر ادبی تاریخ کا ادوار بندیوں میں تقسیم کر کے ادیبوں کو کسی خاص دائرہ بحث میں لانا اور پھر اگلا دائرہ بنا کر ادبی روایت کو توسیع دیتے رہنا ہے اور یہ مورخین کا محبوب طریقہ کار ٹھہرا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بنائے گئے ادوار بندی کے ماڈل کو آنے والے عہد کے مورخین نے من و عن اپنائے رکھا۔ جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" آگے چل کر وہ موڑ ثابت ہوتی ہے جہاں اس سے آگے بڑھ کر تکنیک کی سطح پر متنوع تبدیلیاں پیش نظر رکھ کر ادبی تاریخ نویسی کا منصوبہ بروئے کار لایا گیا۔ چار جلدوں میں منقسم "تاریخ ادب اردو" اپنے مشمولات کے حساب سے حوالے کی چیز ہے مگر اس کے فنی محاسن کو دیکھا جائے تو ادراک ہوتا ہے کہ چاروں جلدوں میں تکنیک کے مختلف ماڈلز پیش کیے گئے ہیں جو اپنے چند معائب اور جملہ محاسن کی بدولت اس مقالے کا موضوع بن رہے ہیں۔

"تاریخِ ادبِ اردو" کے ہیئتی ڈھانچے کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل جالبی نے اردو ادب کی پانچ سو سالہ تاریخ اور آٹھ سو سالہ روایت کو بیان کرنے کے لیے پوری کتاب کو چار سے چھے فصلوں میں تقسیم کیا ہے جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایک ہی فصل میں مذکورہ عنوان کو اس کے عہد کی ممکنہ تمام جہات، اہم اصناف، ادبی شخصیات اور تہذیبی، سماجی اور تاریخی ڈھانچے کو باہم آمیخت کرتے ہوئے ایک وحدت بنانے کی سعی کی ہے۔ اس لیے جب وہ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے درج بالا عوامل کے منطقی انسلاک کو ایک وحدت بنا کے پیش کیا ہے تو راقم کے خیال میں یہ بات یہ دعویٰ ایک دو فصلوں کی حد تک درست ہے لیکن اس جلد کے تمام مشمولات پر یہ بات پوری طرح صادق نہیں آتی۔

اصل میں اس وقت تک مربوط ادبی تاریخ کا تجربہ بہت حد ممکن اس طور نہ ہوا تھا۔ یونیورسٹیز میں ابھی تحقیق کا عمل اتنا فراواں نہیں تھا کہ محقق ایک صدی یا ربع کی مربوط نثری و شعری روایت سے فن پارے علیحدہ علیحدہ کر کے سمجھتا۔ دوسرا یہ کہ اس وقت تک ادبی تاریخ نویسی کے اصول اور ضابطے بھی پوری طرح سماج میں مروج نہ تھے اسی لیے مذکورہ تاریخ میں نہ صرف نثر اور شعر پارے الگ الگ فصلوں میں منقسم نظر آتے ہیں بلکہ بعض جگہ کسی علاقے کی روایت کی تفصیل کے عمل میں ان کا اپنا تسلسل بھی دھندلا پڑتا دکھائی دیتا ہے جسے اس طور نظر انداز کرنا ضروری ہے کہ ابھی تک ادبی تاریخ نویسی تو شخصیت کی رو سے ادوار میں بٹی ہوئی تھی یا علاقائی جزوی تاریخوں کے نمونوں میں موجود تھی یا محض اردو سے قبل کی کھڑی بولی اور برج بھاشا بولیوں کو اردو ثابت کرنے کے نمونوں میں ملتی تھی یا ادیبوں کے تعارفی جائزوں تک محدود مختصر تاریخ منظر عام پر آتی تھی۔

"آبِ حیات" (مولانا محمد حسین آزاد) سے لے کر "تاریخ ادب اردو" (جالبی) تک قریب قریب ایک

صدی کا ارتقائی سفر ہمارے مطالعے میں آتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان تمام ادبی شخصیات کی شخصی و علمی عظمت کا اقرار اپنی جگہ، کوئی مورخ ہمیں تصویری مرقعے دکھانے میں مشغول نظر آتا ہے کوئی منثورات کے نمونے اکٹھے کر کے جزوی تاریخ سامنے لاتا ہے، کوئی مختصر ادبی تاریخ کا فریضہ نبھاتا ہے تو کوئی ہمیں نصابی ضروریات کے لیے طلبا اور طالبات کا نصاب نامہ بناتا ہوا نظر آتا ہے اور احتشام حسین تک آتے آتے ایک نقاد ان تواریخ پر اور ان کی تصنیف، تالیف پر تنقیدی محاکمہ دیتے ہوئے کچھ اصول واضح کرتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ مکمل تو درکنار، پختہ نقش کرنے میں بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسے میں ضرورت پیش آتی ہے کسی ایسے مورخ کو جو اس ضمن میں روایت کا شعور بھی حاصل کرے اس کے معائب کو تاریخ نویسی سے صاف بھی کرے، تسامحات کی اصلاح کرتے ہوئے کوئی ایسا نقش پیش کرے جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بھی معاون ہو اور تاریخ کے سکالر کی رہنمائی کرے لہٰذا ادبی تاریخ کا معتبر نمونہ بھی پیش کرے اور یہ کام کرتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی، "تاریخِ ادب اردو" کی صورت میں وہ شاہکار پیش کرتے ہیں جو آج اپنی پہچان کے عروج پر ہے پہلی جلد جو کہ ۱۹۷۵ میں شائع ہوئی اس کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی اس تاریخ سے کیا منشا ہے۔ چند نکات جو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

اول۔ واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط ادبی تاریخ ہے۔

دوم۔ قدیم ادب کا مطالعہ تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور لسانی عوامل کے تحت کیا گیا ہے۔

سوم۔ ادب کی تاریخ ایک اکائی بنائی گئی ہے (بقول جالبی) جسے ایک ٹکڑے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

جمیل جالبی نے روایت سے جڑے رہتے ہوئے "تاریخ ادب اردو" جلد اول کے پہلے باب میں اردو زبان کے تاریخی تغیرات اور تشکیل کی بحث سے آغاز کیا ہے جو کوئی انفرادیت پر مبنی بات نہیں۔ دیکھا جائے تو اردو کی پہلی ادبی تاریخ "آبِ حیات" سے اردو زبان کی لسانی تشکیل کے مختلف عوامل اور مراحل کے موضوع کو ادبی تاریخ نویسی کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ گو اصولی طور پر یہ باب ادبی تاریخ کا براہِ راست حصہ نہیں بنتا لیکن کسی مورخ کے لیے اس بات کی گنجائش ادبی تاریخ نویسی کی تکنیک میں موجود ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کیا جا سکے۔ اس لیے تاریخ کی تدریس میں بھی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ پڑھاتے ہوئے طالب علم کو بھی ہمیں ان لسانی مباحث کی مدد سے تاریخ سمجھایا جانا آسان دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طور مورخ سمجھتا ہے کہ اس کا قاری ادبی تاریخ کی قرات کے لیے تو تیار ہے لیکن شاید تاریخی لسانیات کے جملہ مباحث اس کے لئے ادق ہوں، اس لیے زبان کا کسی ضمیمے میں ذکر کر دینا تکنیکی ہنر بنتا ہے عیب نہیں۔ لیکن راقم کے اس لسانی جواز کے برعکس رشید حسن خان نے اپنے ایک مضمون میں اس طریقے کو بنظر استحسان نہیں دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا نام "تاریخ ادب اردو" ہے مگر پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جلد اول ۱۷۵۰ء تک کے قدیم ادب اور زبان کا احاطہ کرتی ہے۔ زبان اور ادب کے اس غلط مبحث نے زبان کی بحث کو تضادات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یقیناً زبان و ادب کا باہمی تعلق ہے، لیکن تاریخ نگاری کے لئے زبان اور ادب بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں اور دونوں کے مختلف تقاضے ہیں"۔ (۱)

ان امور پر بحث کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی مورخ نے گجرات دکن کے قدیم ادب کو الگ الگ دیکھنے کی بجائے ایک لڑی میں پروتے ہوئے دیکھا جس سے بہر طور دونوں خطوں کے لسانی اور ادبی سرمائے کی اہمیت اور تفہیم کا اندازہ لگایا جانا سہل ہو سکا۔ اصل میں ایک ہی عہد میں گجرات اور بہمنی سلطنت کے دکن میں لسانی تبدیلیاں وقوع پذیر تھیں۔ گجرات میں مذہبی موضوعات کے لئے زبان کا استعمال تاریخ کا حصہ بن رہا تھا جبکہ دکن میں دکنی شاعری کا آغاز ہونے جارہا تھا۔ اب ان دونوں خطوں کو الگ سے بھی دیکھا جاسکتا تھا لیکن انکی تکنیک کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں کو لسانی اور ادبی تغیرات کے تحت زیر بحث لانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ فیضان شاہد اپنے تحقیقی مقالے میں تحریر کرتے ہیں:

"جمیل جالبی نے گجرات اور دکن کے ادب کو پہلی بار سیاسی اور تاریخی و ثقافتی پس منظر کے ساتھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ ایک مکمل مبسوط روداد کی شکل نظر آتی ہے۔ ادب میں پڑاؤ، ادب کی توسیع، ادبی روایات کے قیام اور ردوبدل سے ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔" (۲)

ان تمام خصائص کے باوصف اس جلد کی تکنیکی بنت دیکھی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ساڑھے سات سو سال کی بالترتیب لسانی، ادبی، تہذیبی اور سماجی تاریخ کی پیش کش سے قریب قریب آٹھ سو صفحات تحریر کیے۔ کُل فصلیں چھے ہیں اور واضح رہے کہ تمام کتب کے مشمولات چار سے چھے فصلوں میں یکجا کیے گئے ہیں۔ ہر فصل چونکہ ایک عہد، ایک تہذیب اور ایک مرکز کا بیانیہ ہے اس لیے اس فصل کے مختلف ابواب میں ہی تمام معلومات کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ جلد اول کے آخر میں پاکستان کے اردو کے عنوان کے پانچ ابواب ملتے ہیں جن کے نام یوں ہیں: پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، لسانی اشتراک (اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی)، سرحد میں اردو روایت، بلوچستان میں اردو روایت۔ راقم ان ضمیموں کی موجودگی کے بارے میں سوچتا سوچتا اس نتیجے پہ پہنچا ہے کہ جالبی نے اس سے دو کام لیے ہیں ایک تو یہ کہ پاکستان میں اردو زبان و ادب کی روایت سے قومی

یکجہتی پہلو سامنے لایا جائے دوسرا اس پانچویں جلد کا ایک اشاریہ سامنے لانا بھی مقصد ہو سکتا ہے جو ان کے ذہن میں تھا لیکن کاغذ پر منتقل نہ ہو پایا۔ ڈاکٹر غلام رسول ساجد نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے تھیسز میں سرحد میں اردو کے ضمیمے کو بے مقصد سمجھتے ہوئے اس کو تنقیص کے دائرے میں رکھا ہے۔[۳]۔ یہ بھی واضح ہے کہ مورخ کا لسانی معلومات بہم پہنچانا ایک مثبت عمل ہے لیکن ادبی تاریخ میں ماہرِ لسانیات بن کر محاکمہ سازی کرنا ادبی تاریخ کی کوئی خدمت نہیں اس لیے جمیل جالبی سے قبل کی اس روایت کو اس مقولے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ضمیمہ جات میں پاکستان کے صوبوں پر مضامین شائع کرنے پر گیان چند جین ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں:

"چار علاقوں کے ادب کا ضمیمے میں بیان کرنا خاکہ نگاری کا بہترین طریقہ نہیں۔ اول تو ضمیمے کا مجموعی عنوان "پاکستان میں اردو" ہی قابل اعتراض ہے۔ پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ اس سے پہلے کے ادب کو کس طرح پاکستان کا ادب کہہ سکتے ہیں۔ جالبی صاحب جب دور حاضر کی آخری جلد لکھیں اور اور اس میں تقسیم ملک کے بعد کے علاقہ پاکستان کے ادب کا بیان کریں تو عنوان "پاکستان میں اردو" مناسب ہو گا۔ انھوں نے جلد اول کو بنیادی طور سے بانٹا ہے۔ فصل اول شمالی ہند، فصل دوم گجرات، فصل سوم تا ششم دکن۔ پھر ان فصلوں کی زمانی تقسیم کی ہے۔ انہی کے بیچ حسب موقع پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے ادیبوں کے لیے جگہ نکالنی چاہیے تھی۔"[۴]

جلد دوم کی مشمولات کا اندازہ لگایا جائے تو اندازہ ہوتا ہے اس جلد کی اہمیت اس طور زیادہ ہے کہ اس میں کم و بیش پوری اٹھارہویں صدی کی ادبی روایات اور رجحانات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ایک جملے میں اس کتاب کو سمیٹا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں "سارے کلیات، ساری تصانیف، کم و بیش سارے اصل تاریخی، ادبی و غیر ادبی ماخذ سے براہِ راست استفادہ کر کے روحِ ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور پوری ذمہ داری، شعور کے ساتھ کم سے کم لفظوں میں اسے بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب میں یہ اہتمام نظر آتا ہے کہ ثقافت، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے تاریخِ ادب کو ایک وحدت، ایک اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس جلد کی فہرستِ مشمولات کا جائزہ لینے سے ایک اہم بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ اس کی تکنیک ہے جس کے بارے میں راقم کا یہ خیال سوال بن کے سامنے آتا ہے کہ اس اہم صدی میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثری نمونے بھی سامنے رکھے ہیں لیکن یہ کہ تکنیک میں نمایاں تبدیلی بروئے کار نہ لا سکے اور روایتی ڈھانچے کو ہی پیشِ نظر رکھا وہ

یوں ہے کہ اس سے قبل شاعری اور نثر کی تواریخ کو الگ الگ رکھ کر حصے بنا دیے جاتے تھے، اسی طور پہ جلد دوم کے گیارہ سو صفحات میں ہمیں کتاب کے دو غیر متوازن حصے نظر آتے ہیں جن میں پانچ سو صفحات شمالی ہند کی ابتدائی شعری روایت سے لے کر ایہام گوئی کے رد عمل کی تحریک تک کے شعرا اور کلام کا احوال موجود ہے۔ اس حصے میں کتاب میں کُل چھے فصلوں میں سے چار فصلوں کا مواد تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگلا حصہ جسے میں سہولت کے لیے دوسرا حصہ کہوں گا اس میں تقریباً پانچ سو صفحات پر صرف ایک فصل شامل کی گئی ہے جس میں رد عمل کی توسیع کے عنوان کے تحت میرؔ و سوداؔ سے لے کر جعفر علی حسرتؔ، ہیبت قلی خان، حسرتؔ جیسے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو تکنیک کی خامی کہا جائے تو بے جا نہ لگے۔ اہم بات یہ ہے کہ فصل ششم کے ایک سو صفحات میں اس صدی کی اردو نثر کی تفصیل موجود ہے جس میں مذہبی نثر، قرآن کے تراجم، مستشرقین کی مشنری و سیاسی اہمیت کی نثری کتب کا ترجمہ، "بھگوت گیتا" اور آگے چل کر "قصہ مہر افروز و دلبر"، "نو طرزِ مرصع"، "نو آئینِ ہندی"، "عجائب القصص" وغیرہ کا مختصر ذکر موجود ہے جو اتنے کم صفحات میں پیش آیا ہے کہ تاریخ نویسی کے نقاد کو خوش نہیں آیا۔ اشاریہ کے الگ سے سو صفحات کتاب کا حصہ نہیں جو کم کیے جا سکتے تھے پر نہ ہوئے۔ ڈاکٹر غلام رسول ساجد اپنے پی ایچ ڈی تھیسز میں ایک اہم نکتہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> "جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو، کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان کا کوئی تدریجی ارتقا نہیں بلکہ شاعری اور نثر نگاری کے تدریجی ارتقا کا خاکہ کچھ تبصروں اور مختلف لوگوں کی آرا کے اعتبار سے ابھرتا ہے۔ لیکن زبان کا ارتقائی عمل، اظہاری صلاحیت سے پہلے کس طرح رونما ہوتا آیا ہے۔۔۔ کون سے عناصر اور جذبات نے زبان کو اتنی قوت سے مالا مال کیا ہے جس کے سبب یہ زبان اظہاری قوتوں کی تکمیل تک معقول اسباب فراہم کرنے کے قابل ہوگئی، ایسے تصورات اس تاریخ سے زندہ نہیں ہوتے۔"(۵)

جلد دوم کی ایک خصوصیت جو اس کو باقی تواریخ سے الگ کرتی ہے وہ ایک باب غیر ایہام گو شعرا کے تذکرے کا ہے جن کو ادب کے مورخ عام طور پر نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، ان شعرا میں اشرف گجراتی، محمد رضی رضی، ثنا اللہ ثنا، سید محمود صابر، عبد الولی عزلت وغیرہ کے نام موجود ہیں۔ ادبی تحقیق کا شناور اگر اس باب کے مشمولات پر تجزیاتی مطالعہ کرے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس عہد میں ہم ہر طرف ایہام گو شعرا کی شوخی و شرارت بھری ادبی روایت سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے ہیں اس عہد میں مرکز کے اندر اور ذرا دور شعرا کس طور اور کس

انداز سے شعری ادب کی تخلیق میں کوشاں تھے۔ صرف ایک فصل پنجم کے پانچ سو صفحات میں میر تقی میرؔ کو دو ابواب کے ڈھائی سو صفحات میں پیش کرنا، رفیع سودا کو اسی صفحات اور میر دردؔ کو چالیس صفحات میں پیش کر کے لکھنو سمیت باقی شعرا کو ایک سو ستر صفحات میں نمٹا دینا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جالبی لکھنے پر آئے تو لکھتے چلے گئے اور بنا کاٹ چھانٹ کے ہر معلوم معلومات کو صفحات کا حصہ بناتے چلے گئے۔

ان دونوں جلدوں کی اہمیت پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری رائے دیتے ہوئے خراج تحسین ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "یہ دونوں حصے آغاز سے اٹھارہویں صدی کے خاتمے تک ادب اردو کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ یہ پہلی تاریخ ہے جس میں اردو ادب کو مختلف ادوار کی مختلف اکائیوں کی شکل میں نہیں بلکہ ادب کی ایک مربوط تاریخی روایت کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ مصنف کے تبحر علمی، تحقیق و تنقید پر یکساں قدرت، محنت شاقہ اور ذہنی بصیرت نے اس تاریخ کو ایک بے مثال تاریخ کا مقام عطا کیا ہے۔ یہ اردو ادب کی واحد تاریخ ہے جس میں تحقیق اور تنقید کا ایک متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام فرد واحد کی محنت کا نتیجہ ہے اس لیے میں اس علمی کام کو ایک ادبی معجزہ سمجھتا ہوں۔"[۶]

جلد سوم (۲۰۰۶) کے پیش لفظ کا مطالعہ کیجیے تو جمیل جالبی کا ایک اقتباس سامنے آتا ہے جس میں وہ اپنی چاروں جلدوں کی حد بندی کرتے ہوئے یوں تحریر فرماتے ہیں:

> "پندرہویں تا سترہویں صدی دکنی اردو ادب کی صدی ہے اور اٹھارہویں صدی مغلیہ سلطنت کے مرکز، دہلی کی صدی ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی دہلی کے ساتھ بیشتر لکھنو کی صدی ہے۔ اس طرح بیسویں اردو زبان و ادب کے تعلق سے بیشتر پنجاب کی صدی ہے۔"[۷]

انیسویں صدی جو کہ حقیقت میں اردو کے صحیح طور پر ترویج و اشاعت کی صدی بنی اس کے ادب کو دو حصوں میں جلد سوم اور چہارم کو شامل کیا گیا ہے۔ تکنیکی ڈھانچے کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جلد سوم میں شامل پانچ فصلوں کے ایک ہزار صفحات میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے جو خوش آئند ہے اور تکنیکی جمود کے خاتمے کا اشارہ ہے۔ جب حسبِ سابق پہلی فصل شعرا کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور مصحفیؔ، جراتؔ، انشاؔاللہ خاں انشؔ، سعادت یار رنگینؔ، اور چند ایک غیر معروف ناموں ولی اللہ محبؔ، مرزا تقی خان ہوسؔ، جسونت سنگھ پروانہؔ، مہدی علی خاں، ذکی

مراد آبادی وغیرہ سے ہوتی ہوئی چار سو صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فصل میں مصحفیؔ وہ خوش نصیب شاعر قرار پاتے ہیں جن کا ذکر صفحہ نمبر ۶۵ سے شروع ہوتا ہے اور باقی شعرا کے ابواب میں بھی تقابل ہوتے ہوئے ۲۸۲ صفحات میں جزوی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ فصل دوم البتہ فورٹ ولیم کالج کے عنوان کے تحت نثری کتب کے احوال کی دنیا ہے جن میں جون گلکرسٹ، میر امن، بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، مظہر ولا وغیرہ کے کے تفصیلی ذکر کے ساتھ فورٹ ولیم کالج ہر حوالے کی چیز بنتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ راقم نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے دوران اس حصہ کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شاید جالبی نے یہ حصہ دقتِ نظری سے نہیں دیکھا ہو گا کیوں کہ اس میں کئی مقامات پر مجھے کتب کی سطح کے تسامحات نظر آئے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ فصل سوم نثر کے تسلسل کا بیان ہے جس میں نو طرزِ مرصع اور فسانہ عجائب کے درمیان کی کڑیوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس جلد میں دو سو ساٹھ صفحات کو نثری کتب کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ تکنیکی طور پر فٹ نوٹ کے بے جا استعمال پر بھی اجمالی بات کی جانی ضروری ہے۔ اس ذیل میں راقم اپنے نقطہ نظر کو گیان چند جین کے ان جملوں کے تابع کرتے ہوئے اقتباس پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اب مجھے ہیئتِ تسوید کے ایک نکتے پر بحث کرنی ہے۔ متن کے نیچے فٹ نوٹ (حاشیہ) کو کن مطالب کے لیے استعمال کیا جائے؟ محمد حسین آزاد نے کم اہم مصنفوں کے حالات لکھنے کے لئے حاشیے کا استعمال کیا۔۔۔ اردو کے ادیبوں کے ذہن میں فٹ نوٹ کا کوئی تعین نہیں، جس بات کو جی چاہا فٹ نوٹ میں ٹانک دیا۔ یہی کیفیت ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب کی ہے۔ یہاں بھی اکثر حواشی کے مطالب کو حاشیے میں جگہ دینے کی وجہ سمجھ نہیں آتی، مثلاً کئی مثنویوں کی تاریخ تصنیف کی بحث متن میں ہے، لیکن اسی سے متعلق کوئی جزو، مصرعِ تاریخ کا کوئی دوسرا نسخہ فٹ نوٹ میں درج کر دیا۔۔۔"(۸)

فصل چہارم میں ناسخؔ، آتشؔ کے دور پر نظر کرتے ہوئے سادہ گوئی کے خلاف رد عمل محققانہ تبصرہ موجود ہے اور اس رد عمل کو جالبی نے طرزِ جدید و تازہ گوئی کا رواج کے عنوان سے موسوم کیا ہے فصل چہارم کا مطالعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں لکھنوی شعر و سخن، ڈرامہ نگاری، واسوخت کے ساتھ ساتھ آتش کی روایت کی توسیع، تکرار اور امتزاج ملتا ہے جس کی مثالیں محمد خان رندؔ، میر وزیر علی صبا، آغا حجو شرف اور آگے چل کر پنڈت دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کی مثنوی کے خصائص و فضائل میں ملتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ حصہ لکھنو کے متعلق جاننے اور محقق کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس جلد کی سب سے عجیب بات فصل پنجم کے پچاس

صفحات پر موجود دو ادیب ہستیاں ہیں جن میں سے ایک نام واجد علی شاہ کا ہے اور دوسرا نام جالبی کے لفظوں میں عوام کے اکلوتے فقیر نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ اور یوں یہ فصل اپنے ساتھ موجود چالیس صفحات کے اشاریے سے مکمل ہوتی ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کو بے شک مبتدی شخصیت قرار دیا جاتا لیکن اس کو لکھنو کے شعرا اور ادبا کے باب میں رکھا جاتا تو یہ فصل بنانے کی نوبت نہ آتی اور یوں ایک بادشاہ ادیب کے پچیس صفحات الگ نہ کرنے پڑتے کیوں کہ میں ٹھوس دلیل سے دعویٰ کرنے جارہا ہوں کہ نظیر اکبر آبادی کا ذکر یہاں پر آنا از حد غیر ضروری تھا۔ استادِ محترم ڈاکٹر عبدالروف شیخ نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں فرمایا تھا کہ تاریخ ادب میں نظیر اکبر آبادی کو کوئی مورخ فِٹ نہیں کر پایا۔ راقم نے اس پہلو کو بغور دیکھا تو اندازہ ہوا کہ واقعی نظیر اکبر آبادی ایک عظیم لیکن بد قسمت شاعر ہے۔ جس کو کوئی مورخ اپنی تاریخ میں جائز مقام و مرتبہ نہیں دے سکا۔ اس کتاب نے مجھے حیران کر دیا کیونکہ جلد سوم میں نظیرؔ کا ذکر بالکل بھی جائز نہیں آتا کیونکہ ۱۷۳۵ میں پیدا ہونے والے نظیرؔ اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ۶۵ سال کی عمر کو چھو رہے تھے (بے شک ان کی وفات ۱۸۳۰ میں ہوئی)۔ اب ایک معتبر اور میچور شاعر کا تذکرہ جلد دوم کے صفحات پر نہ کرنا ایک مورخانہ غلطی نہ بھی کہی جاسکے تو جالبی جیسے بڑے مورخ کے تاریخی شعور اور تاریخیت کے عمل پر سوالیہ نشان بنتا ہے۔ راقم جلد دوم کی فصل پنجم کے آٹھویں باب میں دوسرے شعرا کے عنوان سے دیے گئے سو صفحات سے ان شعرا کی جگہ پر نظیر اکبر آبادی کے پچیس صفحات جوڑ دیے جانے کی صلاح دیتا ہے جن میں ہدایت اللہ ہدایتؔ، میر محمدی بیدارؔ، شیخ رکن الدین عشقؔ، مرزا محمد علی فدویؔ، محمد روشن جوششؔ، شیر محمد خان ایمانؔ اور محمد عابد دلؔ جیسے غیر اہم شعرا کا ذکر موجود ہے۔ نیز ایک مورخ کو کیا امر مانع ہو سکتا ہے اگر جلد سوم میں بھی نظیر کے تذکرے سے کتاب شروع کی جاتی اور بے شک ۱۸۲۵ میں وفات پانے والے مصحفیؔ کا ذکر آخری فصل میں چلا جاتا۔ راقم کو یہ تسلیم ہے کہ مصحفیؔ کا ذکر آخری فصل میں عیب بن جاتا تو اسی کلیے پر میرا ماننا ہے کہ نظیرؔ اکبر آبادی کا تذکرہ آخر میں کرنا بھی جلد سوم کا تکنیکی عیب ہے جن کو درست کیا جانا ضروری ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد چہارم کے مشمولات اصل میں انیسویں صدی کے ادب کا احاطہ کرتے ہیں۔ جلد میں کل چار فصلوں میں انیسویں صدی کے نصف آخر دور کا جزوی تفصیلی بیان ملتا ہے جس کا آغاز غالبؔ کے ادبی احوال سے ہوتا ہے۔ غالبؔ سے متعلق دو سو صفحات کے مواد میں غالبؔ کے احوال و آثار سے لے کر زندگی کے غیر ادبی واقعات، نیز فارسی تخلیقات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کو مختصر کیا جاسکتا تھا۔ اردو ادب کی تفصیل اور اس پراجیکٹ کا تقاضا صحیح ہے لیکن فارسی مواد کو مختصر نہ کرنا غالبؔ کے بیان کو مستحکم ضرور کرتا ہے البتہ اس سے تاریخ کی

طوالت کو کم کیا جاسکتا تھا۔ تکنیکی طور پر یہ بات قابل غور ہے شاہ نصیر اور ذوق کا ذکر غالب کے بعد کے باب میں ملتا ہے۔ اس بات کو اگر جمیل جالبی کے معاصر تاریخ دان ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں دیکھا جائے تو ان کے ہاں شاہ نصیر کا تذکرہ غالب کے بیان سے پہلے ملتا ہے جو تاریخی اعتبار سے درست ہے۔

جلد چہارم کی تکنیک کا قابل غور پہلو یہ ہے فصل اول میں شاعر کے حوالے سے تاریخ کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جو اس ساری فصل کے بقیہ ابواب میں بھی تسلسل کے ساتھ ہے۔ شاہ نصیر، بہادر شاہ ظفرؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، اور آگے روایتی شعرا مہدی مجروح، قربان علی بیگ سالک، ظہیر دہلوی وغیرہ کی ذیل میں حالات و شاعری کے تحت ان شعرا کو زیر تحریر لایا گیا ہے۔ فصل دوم صرف مرثیہ کی صنف کے لئے مخصوص ہے جس کے تیرہ ابواب میں محض لکھنو کے مرثیہ گو شعرا کا ذکر شامل ہے۔ فصل سوم میں سلسلہ تحریر مزاحیہ نثر کے مشمولات پر محیط ہے جس میں اودھ پنچ کی روایت، منشی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، سید آزاد کے مزاحیہ ادب کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں ایک حصہ اکبر الہ آبادی کی نثر اور شاعری کا شامل ہے جس سے یہ فصل اس عہد کے مزاحیہ ادبی زاویوں کا اشاریہ بنتی ہے۔ فصل سوم کا دوسرا حصہ سرسید تحریک میں شامل اردو کے عناصر خمسہ کا تفصیلی تعارف لیے ہوئے ہے جو اپنی جگہ حوالے کی چیز ہے۔ ان پانچ ادبا کے ذکر پر قریب قریب چار سو صفحات کا مواد شامل ہے جس کے مطالعے سے نو آبادیاتی عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی زاویوں کو بخوبی دیکھا گیا ہے۔ اس مقام پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ فصل عجیب انداز سے بے ربطی کا نقشہ بن گئی ہے۔ اس میں نثری اور شعری ہر دو طرح کے مواد نے قاری کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔ اس حصے میں سرسید تحریک کو الگ کر کے دیکھا جاتا تو تاریخ کے تسلسل میں بھی رخنہ نہ آتا اور روایتی شاعری کی ذیل میں شعرا کو بھی علیحدہ کر کے دیکھا جاسکتا تھا جو تاریخیت کے عنصر کو بھی کم کرتا ہے۔ فصل چہارم میں "داستان طلسم ہوشربا" اور "بوستانِ خیال" کا ذکر اس طور اہم بنتا ہے کہ ان دو داستانوں کو اٹھارہویں کے آخری ربع میں دیگر مورخین نے خاص اہتمام سے ذکر نہیں کیا۔ ان داستانوں کے ساتھ دیگر نثری اصنات جن میں سفر نامہ، مذہبی نثری کتب، شعرا کے تذکروں، نعت گوئی کی روایت اور کتب تواریخ میں اردو نثر کے فن پاروں کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور یوں قریب ساڑھے پندرہ سو صفحات پر مشتمل یہ جلد تاریخ ادب اردو کے سلسلے کی آخری لڑی بن کر اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب رہی ہے۔

اب ایک تاریخ کی تکنیک، منہاج، حدود، مشمولات، ادبی تاریخ نویسی کی غائت اور خدوخال کو ڈاکٹر علی جاوید کی کتاب کا یہ پیراگراف بخوبی واضح کرتا ہے جس میں مختلف ماہرین تاریخ نویسی کی تعریفوں کے اہم اجزا یکجا کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ملا۔ کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں

یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر محاکمے شامل ہوتے ہیں۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات کو بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے نے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عمری کہا ہے، سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔۔۔ٹی ایس ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے اے سمینڈز ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔"(۹)

ہمارے نقاد اور محقق کے جدید طرز کے مطالعہ کو ان تحقیقی استفسارات کی حقیقت اور ازاں بعد ان کے حل ڈھونڈنے میں کوشاں ہونا ہو گا۔ اکابرین ادب کے کام کو مدح سرائی کے دائرے سے نکلنا ہو گا۔ توجہ طلب تحقیقی خلاؤں کو نئے سرے سے پُر کرنے کی کوشش ہمارے آئندہ قاری کی تفہیم کی درست سمت کا تعین کرنے میں ممدو معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ چار سو سال کی مربوط ادبی تاریخ کو تیکنیک کی کسی یکساں حد بندی میں رکھ کر نبھایا جانا مشکل امر ہے لیکن ابواب بندی کے کسی بھی پیش کیے گئے منصوبے کی توضیح اور توجیہہ کے متعلق بات کرنا کسی بھی مورخ کا اخلاقی فریضہ بنتا ہے اور اس سے مستقبل کا مورخ رہنمائی بھی حاصل کر سکے گا۔ جمیل جالبی کے اس تاریخ میں پیش کئے گئے متن (مواد) اور تحقیقی معیارات پر الگ سے بات کرنے کی ضرورت بھی نقادان (ادبی) تاریخ نویسی پر لازم ہے جس سے معروضی انداز سے عہدہ برآ ہونا خوش آئند امر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ،، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸، ص ۲۹۳

۲۔ فیضان شاہد، اردو ادب کی تاریخ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، مخزونہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء ص ۲۰۹

۳۔ غلام رسول ساجد، ڈاکٹر، اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ،، فاطمہ آرٹ ساکی ناکہ، برہان پور انڈیا، ۱۹۹۷، ص ۷۹

۴۔ گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۶۸۵

۵۔ غلام رسول ساجد، ڈاکٹر، ص ۷۷

۶۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۹، ص ۱۴

۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، مجلس ترقی ادب،،لاہور، ۲۰۱۳ء،طباعت سوم)ص ۱۵

۸۔ گیان چند جین،ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو مطبوعہ ماہنامہ قومی زبان، انجمن ترقی اردو، کراچی،۲۰۱۹، ص

۸۵

۹۔ علی جاوید،ڈاکٹر، برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۲ص ۱۸-۱۹

References in Roman Script:

1. Rasheed Hassan Khan, Adabi Tahqeeq, Masael o Tajziya, Educational Book House, Ali Garh, 1978, P.293
2. Faizan Shahid, Urdu Adab ki tareekh Nigaari ka Tahqeeqi o Tanqeedi Mutala, Ghair Matbooa Maqalat Baraey PhD. Makhzoona Jamia Miliiya Islamaiya, New Dehli, 2016,P.209
3. Ghulam Rasool Sajid, Dr, Urdu ki Muntakhib Tareekhon ka Tanqeedi jaeza, Fatima Art saki naka, Burhan Pur, 1997, P.79
4. Gayan Chand Jean, Urdu Ki Adabi Tareekhein, Anjuman Taraqqi e Urdu, Pakistan, Karachi, 2000, P.685
5. Ghulam Rasool Sajid, Dr, P.77
6. Tabassum Kashmiri, Urdu Adab Ki tareekh, Sang e Meel Publications, Lahore, 2009, P.14
7. Jameel Jalbi, Dr, Tareekh e Adab e Urdu, Jild Soum,Majlis Taraqqi e Adab, Lahore, P.15
8. Gayan Chand Jean, Dr. Jameel Jalbi, Tareekh e Adab e Urdu Matbooa Mahnama, Qaoumi Zaban, Anjumnan Taraqqi e Urdu, Karachi, 2019, P.85
9. Ali javed , Dr,Bartaanvi Mustashriqeen awr Tareekh e Adab e Urdu, Samar Offist Press, New Dehli, 1991, P.18-19